۱۵ نومبر ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۴۳

اس شمارے میں

اداریہ

مردم شماری کے سلسلے میں

ہمارے فرائض

اردو دوستوں کو بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ ہندوستان میں ابھی تک اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو دشمنی کی لے پہلے سے کم ہے اور ملک میں اردو کی اہمیت، مقبولیت تہذیبی اور ادبی قدر و قیمت کا عام اعتراف ہونے لگا ہے، مگر ابھی تک کئی ریاستی حکومتوں میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے مناسب اقدامات نہیں کئے گئے، خصوصاً اترپردیش، بہار، دہلی، ہریانہ و مدھیہ پردیش کے ارباب حل و عقد نہ اردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا قابل اطمینان انتظام کرتے ہیں، نہ اردو کے چلن کا تحفظ کرتے ہیں اور نہ دستور میں جو خاص اغراض کے لئے اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرنے کی گنجائش ہے، اس کا لحاظ کرتے ہیں۔ جمہوری دور میں ہر فرد کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ اسی لئے انتخابات ہوتے ہیں کہ لوگ اپنی پسند کے افراد کو ودھان سبھا، پارلیمنٹ، میونسپل بورڈ کارپوریشن وغیرہ میں بھیجیں۔ اب اگر کچھ لوگ بعض پارٹیوں کی کوتاہیوں یا بعض افراد کی بے پروائی یا نااہلی کی وجہ سے انتخاب میں حصّہ نہ لیں تو نقصان کس کا ہوگا۔ ظاہر ہے نقصان خود ان کا ہوگا کیونکہ ان کے جذبات و خیالات کی نمایندگی نہ ہو سکے گی۔ اس لئے شکایات کے باوجود ہر فرد کا فریضہ یہ ہے کہ وہ انتخابات میں حصّہ لے تاکہ مجموعی فیصلوں پر اس کی رائے کا بھی اثر پڑ سکے۔ اسی طرح اردو کے حقوق کو تسلیم کرانے میں بہت بڑا رول اردو بولنے والوں کی تعداد کا ہوگا۔ اگر بولنے والوں کی صحیح تعداد سامنے آئی تو اس تعداد کے اثرات سبھی جمہوری ادارے محسوس کریں گے اور اردو دوستوں کے مطالبات کے تسلیم کئے جانے کے لئے راستہ ہموار ہوگا۔ ہمیں اکثر محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے اردو دوستوں میں چونکہ بددلی، مایوسی یا غم و غصّہ ہے اس لئے وہ اپنے اُن حقوق کا بھی استعمال نہیں کرتے جو جمہوریت نے انھیں دئے ہیں اور بالآخر جن کی وجہ سے وہ حالات میں اپنی مرضی کے مطابق پرامن طریقے سے اصلاح کرا سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ ووٹ دینے نہیں جاتے بہت سے لوگ اس کی فکر نہیں کرتے کہ ان کے گھر پر مردم شماری کے نمبر ڈالے گئے یا نہیں، بہت سے لوگ مردم شماری کے دن گھر پر موجود نہیں رہتے۔ بہت سے لوگ غلط اندراج پر احتجاج نہیں کرتے۔ اگر ہر شخص یہ سمجھ لے کہ اپنے حق کا استعمال ضروری ہے، اپنا ووٹ اپنی پسند کے امیدوار کو ضرور

دینا چاہیے۔ مردم شماری کے سلسلے میں خود دیکھنا چاہیے کہ مکان پر نمبر ہے یا نہیں، نہ ہونے کی صورت میں مقامی دفتر کو اطلاع دینا چاہیے اور مردم شماری کے دن گھر پر موجود ہونا چاہیے، اپنے ساتھیوں اور ہمسایوں کو بھی اس طرف توجہ دلانا چاہیے اور مردم شماری کے کارڈ پر تمام ضروری اندراجات کرانے چاہئیں اور خصوصاً یہ دیکھ لینا چاہیے کہ مادری زبان کے خانے میں صحیح اندراج ہوا ہے یا نہیں، تو پھر آئندہ اردو کے حقوق کو منوانے میں قدرتاً آسانی ہوگی کیونکہ عوام کی آواز کو کچھ وقت کے لئے دبایا جا سکتا ہے مگر خاموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ہم اردو دوستوں سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ مردم شماری کو سرکاری کام سمجھ کر یا اردو کے سلسلے میں جو بے انصافی یا بے حسی اکثریت یا حکومت کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہے اس سے بد دل ہو کر اپنے فرض سے چشم پوشی نہ کریں۔ انھیں اس معاملے میں چوکنا اور مستعد رہنا چاہیے اور ہر حال میں مردم شماری کے کام میں کارکنوں کی مدد اور اپنی مدد کرنا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو کی شاخوں اور اردو کی دوسری انجمنوں سے ہماری اپیل یہ ہے کہ وہ تمام اردو دوستوں کو اس سلسلے میں ان کا فریضہ یاد دلائیں اور کہیں کوتاہی ہو تو اس کی طرف حکومت کو توجہ دلائیں صحیح مردم شماری ہمارا بھی فرض ہے صرف حکومت کا فرض نہیں۔

کربل کتھا کا لسانی مطالعہ

ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے شمالی ہند کی پہلی نثری تصنیف "کربل کتھا" جیسی اہم کتاب کا لسانی جائزہ لیا ہے، یہ کتاب مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہو گئی ہے جس کی قیمت چار روپے ہے۔

• شمیم احمد

قدیم کتب کی خریداری

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی نے عربی، فارسی اور اردو کی قلمی و قدیم مطبوعہ کتب، رسائل، اخبارات، فرامین اور نادر مکاتیب کی مناسب قیمتوں پر خریداری کا ایک جامع پروگرام بنایا ہے۔

اس لئے ایسے تمام حضرات جن کی نظر میں قدیم کتب خانے ہوں یا جو حضرات اس طرح کا کاروبار کرتے ہیں مندرجہ عنوانات کے تحت اپنے ذخیرہ ہائے کتب کی مکمل فہرست ارسال کر کے نہایت درجہ اہم کام اور نایاب ذخیروں کی حفاظت میں امداد کریں۔

عنوانات: کتاب کا نام، مصنف، سنہ تحریر و اشاعت صفحات، کتاب کی موجودہ حالت، قیمت۔

(سید محمد حسین رضوی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

دہلی یونیورسٹی میں اردو زبان اور رسم خط کے موضوع پر مذاکرہ

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹ اور ۲۰ دسمبر سنہ ۷۰ء کو اردو زبان اور رسم خط کے موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد ہوگا۔ جس میں اردو زبان کے مستند ادیب اور ماہرین لسانیات اور طلبہ اور اساتذہ مقالے پڑھیں گے امید کی جاتی ہے کہ اس مجلس مذاکرہ کے لئے بیرونی ہند کے ماہرین لسانیات کے مقالے موصول ہوں گے جن حضرات نے اس موضوع پر اپنے مقالے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور جناب سردار جعفری بھی شامل ہیں۔

مجلس مذاکرہ کے تین اجلاس ہوں گے جن میں سے ہر اجلاس میں تین یا چار مقالے پیش کئے جائیں گے اور ان پر مباحثہ ہوگا مجلس مذاکرہ کے موضوعات بنیادی طور پر اردو رسم خط میں ہماری تہذیبی روایات کی آئینہ داری اور اس ضمن کے مختلف مسائل پر محدود ہوں گے اور اردو رسم خط کے صوتیاتی تجربے اور طرز املا کے مسئلے بھی اس مجلس مذاکرہ میں زیر بحث آئیں گے۔ • خواجہ احمد فاروقی

بقیہ صفحہ ۱۱ سے آگے

شدید معلوم ہونے لگتی ہے، اچھا ہوتا کہ اس سلسلے میں زیادہ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا گیا ہوتا۔ بہرحال ڈاکٹر حفیظ قتیل کو ان کے اس تاریخ ساز کارنامے پر مبارکباد دی جانی چاہیے۔

یہ کتابچہ عام کتابی سائز پر چھپا ہے، ضخامت ۷۰ صفحات کی ہے اس پر نہ کہیں قیمت لکھی ہوئی ہے اور نہ ملنے کا پتا، البتہ مولف کا پتا اس طرح لکھا ہوا ہے:

"حفیظ قتیل، حیرت کدہ، مکان نمبر ۳۶۹-۱-۲۲ سلطان پورہ، حیدرآباد، اے پی"

غالباً اسی پتے سے یہ کتابچہ شائقین کو مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر

نسخۂ بھوپال بخطِ غالب سے گلِ رعنا بخطِ غالب تک

دیوانِ غالب کے نودریافت نسخۂ بھوپال کے بخطِ غالب ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب نے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" میں اپنے شکوک کی تائید میں میری بعض تحریروں سے بھی استدلال کیا ہے جو موصوف نے اپنے پہلے مضمون کی اشاعت کے بعد از راہِ عنایت میری رائے طلب کی تھی۔ میرے خط کے دو جملے بھی ان کے تازہ مضمون میں نظر آئے۔ میں نے ایک مضمون میں دیوانِ غالب میں اپریل فول والی غزل کی شمولیت کو اردو تحقیق کا سب سے عبرت انگیز واقعہ قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ لکھتے ہیں:

> "لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس فیصلے میں ذرا عجلت سے کام لیا۔ اس لیے کہ سب سے عبرت انگیز واقعہ تو واقعۂ مذکور کے کامل تیس سال کے بعد ظہور میں آیا اور اس شان کے ساتھ ظہور میں آیا کہ پوری اردو دنیا (بہ شمول ڈاکٹر صاحب موصوف) اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ غالب کے دیوان کے ایک قلمی نسخے کا اسی بھوپال سے اور اسی اپریل کے مہینے میں غالب صدی کے موقع پر ظہور ہوا۔"

غزل کے معاملے میں میں نے عجلت سے بالکل کام نہیں لیا لیکن نودریافت نسخۂ بھوپال کے بارے میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب جذباتیت سے ضرور کام لے رہے ہیں۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ دیوان، غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے تو یہ اس واقعے کی عبرت ناکی کا مقابلہ کیسے کر سکے گا کہ ایک غزل جو ۱۹۲۷ء میں اپریل فول کے طور پر شائع ہوئی تھی وہ دیوانِ غالب میں داخل کر دی گئی۔ دیوانِ غالب کے کئی قلمی نسخے کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں اور تحقیقی اعتبار سے پوری اہمیت رکھتے ہیں۔ رہ گیا قدیم ماخذ میں کلام کا الحاق یا غلط انتساب تو یہ ایک معمولی مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے غالب سے کچھ اور کلام کے غلط انتساب کو اپریل فول کے زمرے میں شمار نہیں کیا۔

میں نے اپنے مضمون "نسخۂ بھوپال بخطِ غالب پر ایک نظر" (شاعر بمبئی جولائی اور اگست ۱۹۷۰ء) میں اس پر روشنی ڈالی ہے کہ بعض خط کی شباہتوں کی بنا پر اس مخطوطے کو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تسلیم کرنے میں شک و شبہ کا باقی رہ جانا کیوں لازمی تھا اور توقیعے کی وجہ سے اس کی گنجائش کیوں نہیں رہی۔ مختصر یہی دلائل میں نے انصار اللہ صاحب کے خط کے جواب میں بھی لکھ دی تھی۔ جن اصحاب نے میرا یہ مضمون ملاحظہ کیا ہے ان کو اندازہ ہوا ہوگا کہ میرے نزدیک اس مخطوطے کی دریافت کا ماحصل یہ نہیں کہ یہ غالب کا لکھا ہوا ہے بلکہ یہ انکشاف ہے کہ غالب کی ابتدائی یا بیدلی رنگ کی شاعری کا دور اسی دیوان کے متن کے کلام پر ختم ہوا تھا۔

اگرچہ یہ میری تحقیق نہیں لیکن میں نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ یہ مخطوط غالب کا لکھا ہوا ہے۔ بالفرض یہ خاص میری تحقیق بھی ہوتی تو مجھے اس کے خلاف کسی ثبوت کو قبول کر لینے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا۔ لیکن مجھے تعجب ہوتا ہے کہ انصار اللہ صاحب اور ان کے ہم نوا کیوں سمجھ رہے ہیں کہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ مخطوطہ غالب کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ ابھی تک انھوں نے صرف ایک قابلِ ذکر بات پیش کی ہے کہ اس مخطوطے کی غزل "دم چند، اغم چند" گلشنِ ہمیشہ بہار مولفہ نصر اللہ خاں خویشگی میں میر امانی اسد کے نام سے درج ہے۔ تذکروں میں اشعار کا غلط انتساب کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تخلص کے اشتراک

کرشن موہن

ایک شہزادی، زار و تنہا

غزلوں میں جوبن کی رنگت
اور نظموں میں جیون جس ہے
قطعہ، رباعی، گیت، اردو ہے
جن سے مزین ساز نفس ہے
میر سے لے کر میراجی تک
اردو میں چاہت کا رس ہے
غالب اور فراق کی عظمت
اس کے جسم و جاں کا کس ہے
دلجو ہے اردو کی خوشبو
جس سے شاد اپنی نس نس ہے
ہستی کا ہر رنگ ہے اس میں
سوزِ محبت، کیفِ ہوس ہے
اردو کا شیدائی رہے گا
جس کو ذرا جینے سے مس ہے
لیکن اردو وقت کے ہاتھوں
آج رہین خار و خس ہے
فرقہ پرستی کے طوفاں میں
آج یہ بیچاری بے بس ہے
حسرت ہے اس کی مستی میں
اس کی ہستی سوزِ قفس ہے
کرشنا موہن اک شہزادی
زار و تنہا ہے، بیکس ہے

کی وجہ سے میسّر ہی نہیں ہوتا ہوگا کہ امانی اسد کا کلام غالب کے نام سے منسوب ہو جاتا ہوگا جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہے، بلکہ غالب کا کلام امانی اسد کے نام بھی چڑھ جاتا ہوگا، خصوصاً اسد تخلص کا وہ کلام جس کو غالب نے اپنے مطبوعہ دیوان سے خارج کر دیا تھا۔ ضرورت اس کی ہے کہ میر امانی اسد کا دیوان قلمی یا مطبوعہ کہیں موجود ہو تو اس پر نظر ڈالی جائے یا کسی اور معتبر حوالے سے یہ ثابت کیا جائے کہ یہ غزل واقعی میر امانی اسد کی ہے۔

دیوان میں درج کلام کے بارے میں عموماً تو یہی ہوتا ہے کہ اس کے برخلاف کوئی دوسرا خواہ غلط نکلتا ہے لیکن اگر یہ غزل یا کوئی اور غزل غالب کے بجائے میر امانی اسد کی ثابت ہو جائے تو پھر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گی کہ نو دریافت نسخۂ بھوپال غالب کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ محض شک و شبہ کو بڑھاوا دینے یا قیاسی بحث و تمحیص سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ تحقیق کے لئے جہاں یہ انتہائی عبرت ناک تھا کہ اپریل فول کی ایک غزل دیوان غالب میں شامل کر دی گئی وہاں یہ بھی عبرت ناک ہوگا کہ غالب کا کلام ان کا تسلیم نہ کیا جائے۔ اس لئے احتیاط یہاں بھی لازمی ہے۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ قلمی دیوان غالب کا لکھا ہوا نہیں ہے تو یہ ایک اہم تحقیقی خدمت ہوگی۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انصار اللہ صاحب، پروفیسر نور الحسن ہاشمی کی حوصلہ افزائی سے یہ باور نہ کر لیں کہ انھوں نے کسی طلسم کو مکمل طور پر توڑ دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ BEATING ARROUND THE BUSH سے بھی زیادہ کام نہ لیں۔ ان کے پہلے مضمون سے تو یہ گمان ہوا تھا کہ انھیں اس مخطوطے کو بخط غالب ماننے سے انکار ہے اور ترقیمے کو وہ اس امکان کی وجہ سے نظر انداز کر رہے ہیں کہ غالب کے لکھے ہوئے نسخے کو مع ترقیمے کے من و عن کوئی دوسرا بھی نقل کر سکتا ہے۔ اس صورت میں غالب کے لکھے ہوئے اصل دیوان کا وجود بہر حال قابل تسلیم ہوتا اور موجودہ نسخے کو کسی اور کا نقل کردہ فرض کرنے کے بعد بھی اس کے مندرجات کے متعلق کوئی شک نہ ہوتا لیکن تازہ مضمون میں انھوں نے صاف طور پر یہ رخ اختیار کر لیا ہے کہ یہ دیوان ایسی جعل سازی کا نتیجہ ہے جو بھوپال میں غالب صدی کے موقع پر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بڑی ہوشیاری سے کی گئی ہے۔ اپنی اس قیاس آرائی کو انھوں نے اپریل فول والی غزل کے لطیفے اور قاری شفیق الحسن خاں شفقی بھوپالی اور جناب توفیق احمد امروہوی وغیرہ کے بعض بیانات کی بے ربطیوں سے تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ شبہات قطعاً بے بنیاد ہیں۔ جن حالات میں یہ مخطوطہ بھوپال سے دستیاب ہوا تھا ان میں جعل سازی کا کوئی امکان نہیں، البتہ سادہ لوحی کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔

مخطوطے کے ترقیمے میں سنہ ہجری کے اعداد درج نہ ہونے سے بھی اس کے کاتب کے بارے میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ ویسے یہ روش غالب سے قریب ہے۔ جہاں وہ کبھی کبھی وقت تک لکھنے کا التزام کرتے تھے وہیں بڑے اطمینان سے سنہ اڑا دیتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ تاریخوں کے معاملے میں انھوں نے ماہرین غالبیات کے ساتھ ستم ہی نہیں بلکہ ستم ظریفی بھی کی ہے ستم اس لحاظ سے کہ تاریخ بالکل حذف کر دی ہے اور ستم ظریفی اس لحاظ سے کہ دن، تاریخ اور مہینہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔

گذشتہ سال لاہور میں گل رعنا کا بھی ایک ایسا نسخہ ملا تھا جس کو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں نہ کوئی ترقیمہ ہے اور نہ کوئی ایسا اندراج جس میں اس کا اظہار کیا گیا ہو کہ یہ غالب کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے دیباچے کے آخر میں "غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری" درج ہے (جو میرے نزدیک دیباچے کی تاریخ تصنیف ہے نہ کہ نسخے کی تاریخ کتابت) اور خاتمے کے آخر میں "حرر دعاگو محمد اسد اللہ" لکھا ہوا ہے۔ لیکن موخر الذکر اندراج صنعت تعطیل میں آغا میر کی مدح کی نثر کے ختم پر آیا ہے جسے سطر سے ذرا الگ کر کے ترچھا دستخط نما انداز میں لکھ دیا ہے۔ کلیات نثر غالب میں مذکورہ مدحیہ نثر کے اختتام پر یہ اندراج اس طرح ہے: "حرر اسد اللہ محررہ دوم محرم الحرام"

چنانچہ اس مخطوطے کو صرف خط کی پہچان کی بنا پر غالب کا لکھا ہوا مانا گیا ہے۔ سید معین الرحمٰن کے تعارف کے ساتھ اس کے چار صفحوں کے جو عکس نقوش، غالب نمبر حصہ دوم میں شائع ہوئے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خط اور انداز کتابت بالکل دیوان غالب کے نو دریافت نسخۂ بھوپال کے مطابق ہے۔ غالب صدی کے سلسلے میں کسی ایک شخص کا یہ دونوں نسخے تیار کر دینا ایک کو ہندوستان میں رکھنا اور دوسرے کو پاکستان پہنچا دینا شاید خود طلب سمجھا جائے گا۔ پھر گل رعنا کا یہ نسخہ تقریباً نصف صدی سے خواجہ محمد حسن کی ملکیت میں ہے اور انھیں اپنے نانا خواجہ احمد اللہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ اس وقت تک اس کے بارے میں یہ بھی خیال ہے کہ یہ کلکتے میں لکھا گیا تھا۔ دہلی سے کوئی عزیز، دوست یا کاتب غالب کے ساتھ کلکتے گیا ہو تو فی الحال اس کا علم نہیں۔ غالباً میری یہ توقع بیجا نہیں کہ آئندہ اس بحث میں اس مخطوطے کے متعلق ان تصریحات کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا، کیونکہ اگر نو دریافت دیوان غالب بخط غالب نہیں ہے یا غالب صدی کی جعل سازی کا نمونہ ہے تو پھر اس مخطوطے کے بارے میں بھی یہی ثابت کرنا پڑے گا۔ یک نہ شد دو شد۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

▲

س اصلاح

غالب سے منسوب ایک رباعی کی حقیقت

۱۵ر اکتوبر کے ہماری زبان میں جناب اکبر علی خاں کا مراسلہ "نسخۂ عرشی زادہ پر ایک اعتراض کی حقیقت" دیکھا۔ اس کی شق (ب) کے تحت انھوں نے غالب سے منسوب ایک رباعی اور دو قطعات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جو ایک مطبوعہ رسالہ "عیدی نامہ" سے اخذ کرکے میں نے ۱۵ر مارچ ۱۹۶۲ء کے ہماری زبان میں شائع کرائے تھے۔ وہاں سے متعدد جگہ نقل ہوئے۔

اکبر علی خاں صاحب کی مسلسل فرمائش پر میں نے اصل ماخذ "عیدی نامہ" ۱۹۶۸ء میں رضا لائبریری رامپور کو بطور نذر پیش کر دیا تھا اور یہ اب وہیں محفوظ ہے۔ "اس وقت تک میرے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ ان میں سے ایک رباعی

"شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز" دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد میں بھی شامل ہے اور میں نے یہ رسالہ نذر کرتے ہوئے اکبر علی خاں صاحب سے عرض کیا تھا کہ اب اس کا انتساب مشکوک ہو گیا ہے اگر نسخۂ عرشی طبع دوم میں اسے شامل کیا جائے تو دیوان ذوق میں مندرج ہونے کا حوالہ بھی آنا چاہیے لیکن اسے انھوں نے اب خالص اپنی تحقیق بنا کر پیش کیا ہے۔ بہر حال یہ تحقیق میری ساری عمر کی کمائی تو تھی نہیں یہاں تو "چور جاتے رہے کر اندھیاری" والا معاملہ ہے۔ لیکن اسی ضمن میں انھوں نے ایک اصول بھی وضع کر دیا ہے جس سے مجھے اور دوسرے حضرات کو بہت مدد ملے گی کہ "چونکہ ایک انتساب اس کتاب کے مرتب کا غلط ہو چکا تھا اور بقیہ دو کو بھی غالب کا تسلیم کرنے کے لئے کوئی قرینہ، قیاس یا دلیل موجود نہ تھی اس لئے ان دونوں کو بھی میں نے قلم زد کر دیا۔"

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مذکورہ رسالہ عیدی نامہ بھی عہد غالب کا چھپا ہوا ہے اور دیوان ذوق کو محمد حسین آزاد نے ذوق کے مرنے کے کئی سال بعد مختلف تحریری یادداشتوں اور زبانی روایات کی مدد سے ترتیب دیا تھا اس لئے کسی شعر کا دیوان ذوق میں ہونا لازماً ذوق کا نتیجۂ فکر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ جب ایک شعر دو معاصر کتابوں میں دو مختلف شاعروں سے منسوب ہو جائے تو ایک کسی کو ترجیح دینے کے لئے سبب ترجیح فراہم کرنا ضروری ہوگا۔

اکبر علی خاں صاحب فرماتے ہیں کہ بقیہ دو قطعات کو غالب سے منسوب کرنے کے لئے کوئی "قرینہ قیاس یا دلیل" نہیں ہے، تو قیاس یہ ہے کہ یہ دو قطعات دیوان ذوق میں نہیں ہیں اور قرینہ یہ ہے کہ ان کا دوسرا کوئی دعوے دار نہیں ہے اور دلیل یہ ہے کہ ایک قدیم کتاب میں غالب کے نام سے چھپے ہوئے ہیں۔ البتہ یہ بات بعض امور میں معاون ہوگی کہ کسی کتاب کے مصنف کا یا مضمون نگار کا ایک بیان غلط ثابت ہو جائے تو دوسرے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یکم ستمبر کے ہماری زبان میں جناب اکبر علی خاں ہی کا ایک مضمون "مخطوطہ گل رعنا بخط غالب" چھپا ہے جس میں انھوں نے یہ اطلاع دی ہے کہ گل رعنا کا غالب کے قلم سے لکھا ہوا جو قلمی نسخہ لاہور میں خواجہ محمد حسن صاحب کی ملکیت ہے اس کے عکس سید معین الرحمٰن صاحب (ایف سی کالج لاہور) کی عنایت سے انھیں حاصل ہو گئے ہیں اور حاشیے میں یہ اطلاع ہے کہ یہ عکس مقدمہ و حواشی کے ساتھ جلد ہی شائع ہوں گے میں نے ایک بہت ثقہ انسان اور معین صاحب کے گہرے دوست کو لکھ کر استفسار کیا۔ ان کا جو کچھ جواب ملا اس کا اقتباس درج کرتا ہوں:

> "معین الرحمٰن صاحب سنتے ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ سوائے صرف ان چار اوراق کے جو نقوش غالب نمبر ۲ میں چھپ چکے ہیں انھوں نے اکبر علی خاں کو کچھ نہیں بھیجا دوسری بات یہ کہ جن صاحب کے پاس مخطوطہ ہے وہ کسی قیمت پر کسی کو دکھانے تک کے روادار نہیں ہیں۔ محترم وقار عظیم صاحب کے سامنے جب دوبارہ گفتگو آئی تو انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ بلاتکلف ہماری زبان کو میرے حوالے سے لکھ دیجئے یا خط لکھ دیجئے کہ اکبر علی خاں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔"
>
> معین الرحمٰن صاحب بھی خود اس کی تردید کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ ہماری زبان کا وہ تراشہ انھیں مل جائے۔
>
> "معین صاحب نے بتایا کہ اس موضوع پر تقریباً ۴ خط یا اس سے بھی زیادہ خطوط اور تار اکبر علی خاں نے ان کے پاس بھیجے، قمر صاحب کو لکھا لیکن جب مالک مخطوطہ راضی ہی نہیں ہوتے کہ کسی کو دکھا دیں تو اکبر علی خاں کو عکس بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
>
> (مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء)

اس کے سوا خط میں کچھ اور بھی ہے مگر میں "باقی داستان فردا شب را" کے خیال سے اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ بقول اکبر علی خاں صاحب اگر کسی کا ایک بیان غلط ثابت ہو جائے تو دوسرا بھی قابل یقین نہیں رہتا۔ چنانچہ ان کا یہ بیان غلط نکلا کہ گل رعنا بخط غالب کے مکمل عکس انھیں طباعت و اشاعت کے لئے معین الرحمٰن صاحب کی مہربانی سے حاصل ہو گئے ہیں تو یہ دوسرا بیان بھی غلط ہونا چاہیے کہ غالب سے منسوب رباعی کا دیوان ذوق میں تلاش

کرنا ان کی ذہنی کاوش ہے اور میں نے ان کو یہ اطلاع نہیں دی تھی۔

دہلی   • نثار احمد فاروقی

جونیر ہائی اسکول درجات میں اردو کی درسی کتابیں

۲۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کے "ہماری زبان" میں صفحہ ۸ پر جناب برجمن نورانی کا نوٹ "شعبۂ اردو، گورکھپور یونی ورسٹی میں حالیہ ریفریشر کورس کے متعلق" نظر سے گذرا۔ میں اس نوٹ کے بیشتر حصّے سے متفق ہوں نورانی صاحب لکھتے ہیں:۔

"مودبانہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت سب سے اہم ضرورت اردو کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی ہے۔ اگر آپ درخت کی چوٹی پر پہنچ چکے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جڑ کی کمزوری اور شاخوں کی خشکی سے بے خبر ہوں۔ جب جڑیں کٹ رہی ہوں یا ان میں دیمک لگ چکی ہو تو ہر آن درخت کے گرنے کا خطرہ رہتا ہے اور خدانخواستہ درخت گرا تو آپ بھی اس بلندی سے نیچے آجائیں گے۔ اگر اردو اساتذہ کو ایّام تعطیلات میں یکجا کرکے اردو پڑھواتے طلبہ کے لئے بنیادی تعلیم کے اسکول قائم کرنے کا کوئی پروگرام بنا کر اس کے لئے عملی اقدامات کرتے یا کسی ایک علاقہ کو منتخب کرکے اس میں اردو پڑھنے والوں کی دشواریوں کی جانچ کرکے ان کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کی جدوجہد کی جاتی یا پھر پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے والے اساتذہ کے لئے تربیتی کیمپ قائم کرتے جس میں ان کو جدید طرز پر اردو کی تدریس کے طریقے سکھانے کی کوشش ہوتی تو یہ ایک اہم خدمت تھی اور ایسی چیزوں کی اس وقت ضرورت ہے۔"

ہمارے پرائمری اسکولوں میں اوّل تو اردو داں استادوں کی کمی ہے اور جو تھوڑے بہت ہیں وہ اردو تعلیم کے طریقے سے ناواقف ان کی بی۔ٹی۔سی کی ٹریننگ میں اردو نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک ابتدائی درجات میں اردو کے طریقہ تعلیم کا تعلق ہے ان کی معلومات صفر کے برابر ہیں۔ بیسک اردو ریڈروں کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ ابھی تک ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

اتر پردیش میں جب طالب علم درجہ ۵ پاس کرکے آتا ہے تو (اگر اس نے درجہ ۵ میں اردو بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے لے لیا) اس کو دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درجہ ۶ کے لئے اردو کے دو علاحدہ کورس رائج ہیں۔ پہلا کورس ان طلبہ کے لئے ہے جنھوں نے درجہ ۵ تک اردو بحیثیت ایک مضمون کے نہیں پڑھی ہے اور اب ان کو درجہ ۵ سے لے کر درجہ ۸ تک بیسک اردو ریڈروں کے پانچوں حصّے پڑھنا ہیں۔ دوسرا کورس ان طلبہ کے لئے ہے جو درجہ ۵ تک اردو پڑھ کر آئے ہیں اور ان کو بہارستان یا ادبستان کے تین حصّے درجہ ۵ سے ۸ تک پڑھنا ہیں۔ یعنی ہر ایک درجہ میں ایک حصہ ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا بطور درسی کتاب کے پڑھنا ہے۔ چونکہ طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اس لئے بیشتر اسکولوں میں ایک ہی استاد ایک ہی گھنٹے میں ان دونوں کورسوں کو پڑھاتا ہے۔ اب وہ کیا پڑھاتا ہے اور کس طرح پڑھاتا ہے یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

۷۷-۱۹۷۶ء میں مجھے نجیب آباد میں اس کے متعلق ایک چونکا دینے والا تجربہ ہوا۔ اردو ٹیچر کے ریٹائر ہو جانے کے بعد کئی ہفتہ تک جب دوسرا اردو ٹیچر نہیں آیا تو میں نے درجہ ۶ کو خود پڑھانا شروع کر دیا۔ طلبہ کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ نصف گھنٹہ پہلے کورس کے لئے رکھا گیا اور نصف دوسرے کے لئے۔ ایک ہفتہ کے بعد تمام طلبہ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بہارستان پڑھیں گے۔ بیسک ریڈر نہیں۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ تم میں سے بہت سوں کو الف، بے، تے نہیں آتی "بہارستان" حصہ اوّل کیسے پڑھو گے۔ جواب ملا کہ پہلے الف، ب، تے، پڑھا دیجئے اس کے بعد "بہارستان" پڑھائیے۔ میں تیار ہو گیا۔

لڑکوں نے دلچسپی دکھائی اور محنت کی۔ لیکن اس ابتدائی تیاری میں ایک ماہ کے قریب لگ گیا۔ بہارستان اردو اب سے پندرہ برس پہلے مرتب کی گئی تھی۔ اس وقت بھی میرا یہ خیال تھا کہ یہ مجموعہ ان جماعتوں کے لئے طلبہ کے معیار سے کہیں زیادہ بلند ہے اب پندرہ برس بعد معیار اور زیادہ گر چکا ہے۔ بہارستان اردو کا پہلا حصہ نمونہ کے طور پر درجہ نہم کے طلبہ کو پڑھایا اور اس کو ان کے معیار سے بھی بلند پایا۔ مجبور ہو کر مکتبۂ جامعہ دہلی کی اردو کی پہلی کتاب اور دوسری کتاب پڑھائی۔ لڑکوں نے کتابیں دہلی سے منگائیں۔ یہ کتابیں ان کے معیار کی تھیں۔ طلبہ نے پڑھنے میں کافی دلچسپی لی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا ششماہی امتحان قریب آگیا اور پھر بہارستان حصہ اوّل سے طبع آزمائی ہونے لگی۔ اس اثنا میں نئے اردو ٹیچر آگئے۔ اور وہ بھی اس کشمکش میں مبتلا ہوگئے کہ کونسی کتاب پڑھائیں۔

"ادبستان" طلبہ کے لئے "بہارستان" سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں پرائمری اور جونیر ہائی اسکول کلاسوں کے لئے اردو کی درسی کتابیں تیار کرنا ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ اگر اس کام کو اپنے ہاتھ میں

لے سے تو مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے گا۔ کتابیں چونکہ معیاری اور اچھی ہوں گی محکمہ تعلیم بھی ان کو منظور کر سکتا ہے۔ کتابوں کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد ابتدائی درجات کے مدرسین کے لئے ریفریشر کورس کا مسئلہ ہے۔ اس ریفریشر کورس کا انتظام محکمہ تعلیم کو کرنا ہے۔ اس کی مدت کم سے کم تین ماہ ہونا چاہیئے۔ اور ان درجات میں پڑھانے والا ہر اردو مدرس لازمی طور پر اس ریفریشر کورس میں شرکت کرکے اس کا امتحان پاس کرے اور سرٹیفکٹ حاصل کرے۔ اس ریفریشر کورس میں اردو زبان و ادب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ابتدائی درجات میں اردو پڑھانے کے جدید طریقوں پر لیکچر بھی دئے جائیں اور بنیادی طریقۂ تعلیم پر بھی بحث و مباحثہ ہو اور یہ مدرسین کم از کم ۱۵ اسباق درجہ ۱ سے لیکر درجہ ۸ تک کسی اسکول میں نگراں کی نگرانی میں جاکر پڑھائیں، تب کہیں جاکر یہ گتھی سلجھے گی۔ ورنہ بقول نورانی صاحب جب چڑا اور پتوں کو دیمک لگ گئی تو پیڑ کا قائم رہنا مشکل ہے۔

بریلی۔ • مبشر علی صدیقی

سودا کا ایک شعر

حالی اور شبلی نے اپنی کتابوں میں یہ تحریر کر دیا کہ سودا کا یہ شعر ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نظیری کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

بوے یار من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار رشدم

اور ان دونوں بزرگوں نے اس ترجمہ یا اخذ پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ بعد کو دوسرے ادیبوں نے بھی ان کا تتبع کیا لیکن دراصل سودا کا یہ شعر ترجمہ ہے صائب کے اس شعر کا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

تمام از گردش چشم تو شد کار من اے ساقی
ز دست من بگیر ایں جام را کز خویشتن رفتم

"از خویشتن رفتم" میں وہ بات نہ آسکی جو "چلا میں" میں ہے۔

لکھنؤ۔ • نور الحسن ہاشمی

ایک شعر کے بارے میں

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

ہماری زبان مورخہ ۲۲ ستمبر ۷۰ء میں جناب عابد حسین صاحب راسی نے جس شعر (مندرجہ بالا) کے نسبت استفسار فرمایا ہے وہ کوئی آٹھ سال قبل ہماری زبان کے صفحات پر زیر بحث آچکا ہے۔

ابتداً اشاعت مورخہ یکم فروری ۶۲ء میں جناب عطاءاللہ صاحب سیجے پوری کے استفسار کے جواب میں جناب معراج دھولپوری نے بحوالہ گلدستہ "تحفۂ ممتاز" اس شعر کو حضرت عالمگیر خان کیف ٹونکی کا نتیجۂ فکر بتلاتے ہوئے پوری غزل نقل کی ہے۔

بعد ازاں اشاعت مورخہ یکم مارچ ۶۲ء میں جناب سلیمان ظفر صاحب نے اسی زمین کے تین چار اشعار جن میں شعر زیر بحث بھی شامل ہے اور جو موصوف نے کسی منتخبی سے حسنے تھے نقل کرتے ہوئے اس کو غالب کا بتلایا ہے۔ لیکن یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ یہ اسد اللہ خاں غالب نہیں ہیں کیونکہ مرزا کے کسی مطبوعہ نسخہ یا نسخۂ حمیدیہ میں یہ غزل نہیں ہے۔

بالآخر اشاعت مورخہ یکم اپریل ۶۲ء میں جناب محمد عمر صاحب سیفی نے جناب معراج دھولپوری کی تائید فرماتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ یہ شعر امام الشعرا حافظ عالمگیر خان کیف ٹونکی ہی کا ہے اور موصوف کے "دیوان عاشقانہ" غیر مطبوعہ میں بضمن غزل درج ہے اور یہ قلمی نسخہ "دبستان کیف" ٹونک راج میں محفوظ ہے۔

عرصہ دراز قبل راقم الحروف نے بھی کسی گلدستہ یا مجموعۂ کلام سے یہ غزل نوٹ کی تھی جس کے اشعار۔ مطلع و مقطع خفیف اختلاف سے وہی ہیں جو جناب معراج دھولپوری نے تحریر فرمایا ہے۔ اس لحاظ سے یہ شعر حضرت حافظ عالمگیر خان کیف ٹونکی ہی کا قرار پاتا ہے۔

• داد ابجائی کادس جی

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

پرچھائیوں کی وادی

مصنف: انور عظیم
ناشر: مکتبہ ملاقات گلی قاسم جان دہلی ۶
صفحات: ۲۰۲

سفر ایران

مصنف: ڈاکٹر رضیہ اکبر
ناشر: ادبی ٹرسٹ بک ڈپو کتار اینگ بلڈنگ عابد روڈ۔ حیدر آباد
صفحات: ۱۸۵

راز محبت

مرتب: ریحانی لکھنوی
ناشر: ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس ۱۱ لکھنؤ۔ یو۔ پی
صفحات: ۱۱۴

اخبار و افکار

آندھرا پردیش انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاس میں غور طلب مسائل

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا جو سالانہ جلسہ ۱۲ و ۱۳ دسمبر کو کرنول میں منعقد ہو رہا ہے اس میں اردو سے متعلق ایک جامع لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا۔ اردو کے طلبہ کے لئے بھی انہی سہولتوں کا مطالبہ کیا جائے گا جو تلگو کو حاصل ہیں۔

اس سال یہ اجتماع اس لئے بھی خصوصیت کا حامل ہوگا کہ حکومت آندھرا پردیش نے تلگو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے نہ صرف انتظامی امور میں بلکہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں بھی بحیثیت ذریعہ تعلیم رائج کرنے کے فیصلے پر عمل شروع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے دنوں آندھرا پردیش کی تینوں یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی کانفرنس میں حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ جو طلبہ تلگو ذریعہ تعلیم سے امتحانات کامیاب ہوں ان کی ملازمتوں کے معاملے میں ہمت افزائی کی جائے اور ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے۔ لیکن اس موقع پر آندھرا پردیش میں اردو بولنے والوں کی جو خاصی تعداد بستی ہے اس کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ اردو میڈیم کے طلبہ بھی ان تمام سہولتوں کے مستحق ہیں جو تلگو میڈیم والوں کے لئے مہیا کی جائیں گی خواہ ان کا تعلق ملازمتوں میں ہمت افزائی سے ہو یا مقابلے کے امتحانات سے۔ اس سلسلے میں انجمن نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ تلگو کے ساتھ ساتھ اردو بولنے والوں کی ضرورت کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ لیکن اس بارے میں حکومت ابھی تک خاموش ہے اس لئے کرنول کے اجتماع میں اس مسئلہ پر خصوصی توجہ دی جائے گی اور ایک جامع لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا تاکہ کوئی موثر قدم اٹھایا جاسکے۔ اس کے علاوہ حسب ذیل مسائل پر بھی غور کیا جائے گا۔

(۱) اردو میڈیم کے جونیر کالج تو حسب ضرورت قائم کر دئے گئے ہیں لیکن نصابی کتب اور اساتذہ کا خاص طور پر سائنس پڑھانے والے اساتذہ کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے انجمن کے دفتر پر مسلسل شکایتیں وصول ہوتی رہتی ہیں۔

(۲) اردو کے تعلق سے حکومت کی معلنہ پالیسی پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے محکمہ تعلیمات اور خاص طور پر ضلع پریشد اور پنچایت سمیتیوں کے تحت چلائے جانے والے مدرسوں میں اردو کی متوازی جماعتوں کے کھولنے کا بروقت انتظام نہیں ہوتا اور متواتر نمائندگیاں کرنے پر اگر جماعت کا قیام عمل میں آجائے تو اساتذہ کا بندوبست نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے اردو مادری زبان کے طلبہ کا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ نتیجتاً فوقانی مدارس کے نتائج میں انحطاط آگیا ہے۔ اس سال تو کئی ہائی اسکولوں سے کوئی طالب علم کامیاب نہیں ہوا۔

(۳) اردو کی متوازی جماعتوں کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ جگہ کی فراہمی اور عطیوں کا لزوم ہے۔ ضلع پریشد اور پنچایت سمیتیوں کے تحت چلنے والے مدارس پر یہ شرائط دوبارہ عائد کردی گئی ہیں اور انجمن کی نمائندگی کے باوجود اس کی عمل آوری پر اصرار کیا جاتا ہے۔

(۴) نظم و نسق اور عدالتوں میں اردو کی حیثیت کو منوانے کا سوال بھی ہنوز حل طلب ہے۔

(۵) اگلا سال مردم شماری کا سال ہے اس سلسلے میں اردو بولنے والوں پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے۔

● حبیب الرحمٰن معتمد عمومی

افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے مقاصد کی تائید

ادارہ فروغ ادب کے زیر اہتمام ادیبوں اور شاعروں کے اجتماع نے ایک قرارداد کے ذریعہ ۱۰ ر نومبر سے نئی دہلی میں ہونے والی مجوزہ افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے مقاصد کی بھرپور تائید کا اعلان کیا ہے قرارداد جناب جاندار افسر ایڈیٹر انڈین نیوز سروس نے پیش کی۔

متن اس طرح ہے

"یہ اجتماع دہلی میں ماہ نومبر کے دوران ہونے والی افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے بنیادی مقاصد سے اپنے کامل اتفاق کا اظہار کرتا ہے تاکہ ایشیا اور افریقہ کا دانشور طبقہ ایک آواز کے ساتھ سامراج شاہی کی فتنہ طرازیوں پر صدائے احتجاج بلند کرے اور عرب و ویتنامی عوام کو ان کی تحریکات امن و آزادی سے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلائے۔"

اس اجتماع کی صدارت جناب راز عابدی نے کی۔ جناب نظیر علی عدیل، نواب مظفر الدین صاحب، جاندار افسر، ارادت جاندار جاہی، اسماعیل ظریف، صاحبزادہ کلیم، حسام الدین سلیم، جوہر ہاشمی، حبیب محوی اور فاروق شکیل نے نظم و نثر میں کلام سنایا۔

● حبیب محوی معتمد عمومی

مشاعرہ و جلسہ قومی یکجہتی

ادارۂ برگ آوارہ کے زیر اہتمام دیوان ڈیوڑھی حیدرآباد میں ایک مشاعرہ اور جلسہ قومی یکجہتی کا انعقاد عمل میں آیا۔ مشاعرہ و جلسہ کی صدارت ریاستی وزیر مارکٹنگ شری رام چندر راؤ کلیانی نے کی۔ اور مہمان خصوصی شری ایم ستیہ نارائن صدر سٹی

کانگریس سے تھے۔

ادارۂ برگِ آوارہ کے بانی و پندرہ روزہ رسالہ "برگِ آوارہ" کے مدیر جناب محمود خاور نے ادارہ کے قیام اور رسالہ کی اشاعت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ ادارہ کا مقصد اردو کے عظیم و منفرد اور صاحب طرز شاعر جناب خورشید احمد جامی مرحوم کی یاد کی شمع کو جلائے رکھنا علمی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ کے ساتھ بہترین کتابوں کی اشاعت و نکاسی ہے۔

• سید احمد

نئے زاویے کی ایک ادبی نشست

گورکھپور: "نئے زاویے" کی ایک نشست ڈاکٹر سلام سندیلوی کی صدارت میں مقبول حسین کی قیام گاہ پر ہوئی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنا مضمون "نقاد کے لئے فن کار ہونے کی ضرورت" پڑھا۔ اور پھر اسی عنوان پر مذاکرہ ہوا۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے ایم کوٹھیاوی راہی نے کہا کہ نقاد کے لئے فن کار ہونا بہر حال ضروری ہے۔ آج کے بیشتر نقاد تخلیق کے کرب سے ناآشنا ہیں وہ جذبے کی تہوں تک پہنچے بغیر تخلیق کو پرکھتے ہیں جس سے تنقید کا حق کما حقہٗ ادا نہیں ہوتا اسی لئے نقاد کا فن کار یا تخلیق کار ہونا ضروری ہونا چاہئے۔ جیسے مجنوں، فراق، سید احتشام حسین اور آل احمد سرور وغیرہ۔ یہ وہ "فن کار نقاد" ہیں جن کی نگاہ فن کار کے تخلیقی جذبے تک پہنچی ہے برعکس اس کے وہ نقاد جنھوں نے کوئی تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے تخلیقی مواد کی اہمیت کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکے ہیں۔ کیونکہ ان میں "رسائی نظر" کا فقدان رہا ہے۔ ادب کو ایسے نقادوں سے ہر دور میں نقصان اٹھانا پڑا ہے اور پڑ رہا ہے۔ انجم عرفانی نے راہی کے اس خیال سے عدم اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نقاد کا فن کار ہونا کبھی ضروری نہیں رہا ہے۔ فراق سے اچھے شعر کی توقع کی جا سکتی ہے تو اچھی تنقید کی نہیں۔ موسیٰ مجروح نے کہا فراق کی تنقید نگاری بعض اوقات ان کی شعر گوئی سے بڑھ جاتی ہے۔ کچھ مثالوں کے ذریعہ انھوں نے اسے ثابت بھی کرنے کی کوشش کی۔

مقبول حسین نے کہا نقاد کا فن کار ہونا اس لئے بھی ضروری نہیں کہ اگر وہ تخلیقِ فن کی طرف توجہ دیگا تو اس کی تنقیدی صلاحیت دب جائے گی۔ ڈاکٹر سلام نے کہا کہ اگر نقاد شاعری یا افسانہ نگاری سے ناآشنا ہے تو اس سے شعر یا افسانے کے ساتھ انصاف ممکن نہیں۔ میں خود جتنے بہتر طریقے سے شعر پر تنقید کر سکتا ہوں اتنے بہتر طریقے سے افسانے پر نہیں۔ اس لئے کہ میں خود شعر کہتا ہوں مگر افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ اسی طرح جو لوگ شعر نہیں کہہ سکتے وہ شعر پر صحیح تنقید نہیں کر سکتے۔

نور گورکھپوری نے کہا فن کار وہ ہے جو اپنی جگہ شاعر و افسانہ نگار نقاد بھی کچھ ہو یعنی جس میں یہ بھی صلاحیتیں موجود ہوں۔

• مہیش اشک

پنج آہنگ کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست

گورکھپور: "پنج آہنگ" کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست جناب موحّد عباسی کے مکان پر زیر صدارت جناب مرغوب حسن منعقد ہوئی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر احمر لاری نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مضمون (THREE VOICES OF POETRY) کا ترجمہ بعنوان "شاعری کی تین آوازیں" سنایا۔ اس مضمون پر تفصیل سے بحث ہوئی اور اس کی روشنی میں اردو شاعری کے اصناف اور جدید شعری رجحانات کا جائزہ لیا گیا۔

• افغان اللہ خاں

انجمن اردوئے معلّٰی مسلم یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ادبی نشست

فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں انجمن اردوئے معلّٰی کی جانب سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب پروفیسر آل احمد سرور نے فرمائی۔ اس جلسے میں شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طالب علموں کے علاوہ یونی ورسٹی کے دوسرے معزز حضرات نے بھی شرکت کی۔

سب سے پہلے قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے اپنا مقالہ "غالب کا غم" پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے معروضی انداز میں غالب کے غم کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ غالب اگرچہ خود اپنی ذاتی زندگی کی دشواریوں اور آلام زمانہ کے ہاتھوں بے حد مضطرب رہے اس کے باوجود بھی انھوں نے غم کو آورشی حیثیت سے پیش کرنے یا اسے اپنی فکر کا مستقل محور بنانے کی کوشش نہ کی بلکہ زندگی کی متضاد حقیقتوں کے امتزاج سے حسن کاری و حسن پرستی کا ایک جاذب نظر معیار پیش کیا۔

اس کے بعد جناب مہر الٰہی (م۔ ندیم) نے اپنا افسانہ "ہاتھ کی قبر" پڑھ کر سنایا۔ اس افسانے کا مرکزی خیال مجروح ذات کے تجربات پر مشتمل تھا (ایم۔ ندیم) کا افسانہ بحیثیت مجموعی علامتی تکنیک کا ایک گرانقدر تجربہ تھا۔

ان کے بعد محترمہ عارفہ نزہت نے اپنا افسانہ "آخری سودا" پڑھا جسے ان کی ابتدائی مشق کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ایک فرد کی زندگی کی خاصی جاندار تصویر پیش کرنے کی کوشش کی جو عیش و طرب کی فراوانی کے باوجود زندگی کے لمحات کو خوش آئند بنانے سے قاصر ہے۔

جلسہ برخاست ہونے سے پہلے صدر جلسہ جناب پروفیسر آل احمد سرور نے ایک مختصر سی تقریر بھی فرمائی۔ آپ نے کہا کہ انجمن اردوئے معلّٰی خصوصاً طالب علموں کے لئے ہے جس میں انھیں بلا جھجک حصہ لینا چاہئے اور اس کے جلسوں میں اپنی تخلیقات

پیش کرتی چاہئیں۔ آپ نے جلسے میں حصہ لینے والے طالب علموں کو مبارکباد پیش کی۔

• قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی سکریٹری

اردو کالج کے قیام کی تجویز

لکھنؤ: رفاہ عام ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ نے جس کی صدارت ڈاکٹر خان کر رہے تھے ایک تجویز کے ذریعہ یہ طے کیا گیا ہے کہ رفاہ عام کے حدود میں ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جس میں سائنس، اقتصادیات، عمرانیات، زراعت و صنعت وغیرہ کے مضامین کی تعلیم دی جائے اور کالج اردو میڈیم ہو۔

چنانچہ ایسوسی ایشن نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس کالج کے منصوبہ کی تکمیل کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر کی جائے جس میں ڈاکٹر خان جناب مجتبیٰ احمد صدیقی شیخ مقبول احمد لاری، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی شامل ہوں۔ یہ کمیٹی اس کالج کے قیام کے سلسلے میں اپنی ایک اسکیم مرتب کرے گی۔

• قومی آواز

عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کو پھر سے نافذ کیا جائے

ورنگل: محلہ پچتن ورنگل میں شہریوں کا ایک جلسہ عام بصدارت جناب محمد عبد الرزاق ایڈوکیٹ منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں باتفاق آراء منظور ہوئیں۔

شہریان ورنگل کا یہ جلسہ، حکومت آندھرا پردیش سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جو ملک بھر میں اردو ذریعہ تعلیم کی واحد یونیورسٹی ہے اس میں اردو ذریعہ تعلیم کو پھر سے نافذ کیا جائے اور آئندہ سال تعلیمی سے ڈگری کورس کی تعلیم اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ آغاز کی جائے تاکہ اردو جونیر کالجس کے طلبہ انٹرمیڈیٹ کامیاب ہونے کے بعد جامعہ کی سطح پر اپنی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ جاری رکھ سکیں اور ذریعہ تعلیم کی تبدیلی سے پیش آنے والی دقتوں کا شکار نہ ہوں۔ حکومت آندھرا پردیش نے ۱۹۶۶ء میں قانون سرکاری زبان میں اردو کے سرکاری استعمال کے متعلق ایک اور دفعہ کی شمولیت کے ذریعہ سے اختیارات حاصل کئے ہیں اور اردو بولنے والوں کے لئے حقوق کا تعین دیا ہے لیکن ان کے عملی استعمال اور وضاحت سے اب تک گریز کیا جا رہا ہے لہٰذا یہ جلسہ حکومت آندھرا پردیش سے مطالبہ کرتا ہے کہ آندھرا پردیش گزٹ میں اردو علاقوں اور سرکاری مقاصد کے لئے اردو زبان کے استعمال کی وضاحت بعجلت ممکنہ شائع کرے اور دفاتر میں اردو کے استعمال کے لئے عملی طور پر موثر اقدام کرے۔ یہ جلسہ حکومت آندھرا پردیش سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مصدرہ احکام کی کماحقہ تعمیل اور عمل آوری کے لئے ہر ضلع پر ایک چیف انسپکٹر اردو مقرر کرے تاکہ اردو زبان کے تعلق سے مدارس میں جو لاپرواہی اور کوتاہی ہو رہی ہے اس کا انسداد ہو سکے اور حکومت کے احکام کا منشاء پورا ہو۔

• رہنمائے دکن

اردو کی حفاظت ہندوستانی تہذیب کی حفاظت ہے

دہلی: جیمفورڈ کلب کے وسیع سبزہ زار پر منعقد ہونے والے جشن وی شنکر کے کل ہند مشاعرہ سابق آئی سی ایس افسر جناب وی شنکر کی اردو دوستی کے اعتراف میں منعقد کیا گیا جو انھوں نے زبان و ادب سے وابستہ کر رکھی ہے۔

مشاعرے کی صدارت سابق میئر دہلی جناب نور الدین احمد نے فرمائی اور افتتاح لیفٹیننٹ گورنر جناب اے۔ این جھا نے کیا جنھوں نے وی شنکر کی اردو نوازی کے سلسلہ میں چاندی اور سونے کی بنی ہوئی گنگا جمنی ٹرانی پیش کی۔

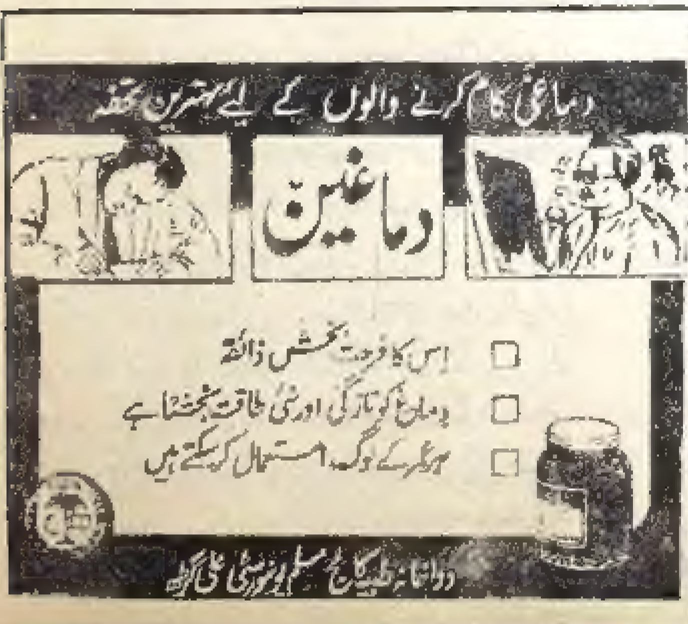
مشاعرے سے قبل مشہور افسانہ نگار کرشن چندر اور ظلی صدیقی نے دو مقالے پڑھے جن میں جناب وی شنکر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔

جناب وی شنکر نے جوابی تقریر کرتے ہوئے اردو زبان کے مسائل پر اور اردو دشمنوں کی تنگ نظری پر اظہار خیال کیا اور اردو کے مستقبل کو تابناک و تابندہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی حفاظت کرنا ہندوستانی تہذیب کی حفاظت کے مترادف ہے۔

اس مشاعرے میں ہندوستان کے ممتاز اور نامور شعرائے کرام نے سامعین کو محظوظ کیا۔

• الجمعیۃ

▲



تبصرہ

(ڈاکٹر) محمد انصار اللہ

معراج العاشقین کا مصنف

مولف: ڈاکٹر حفیظ قتیل، شعبۂ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدرآباد۔

معراج العاشقین کی دریافت اور اشاعت کو اب کم و بیش نصف صدی گزر چلی، اس طویل مدت میں یہ کتاب خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کی جاتی رہی ہے، اردو زبان و ادب کے ناقدوں، محققوں اور مورخوں نے اسے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کو خواجہ صاحب سے منسوب کرنے کی روایت کچھ اتنی ضعیف تھی کہ اول روز سے اس پر شبہ کا اظہار بھی کیا جاتا رہا ہے اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کو غالباً اولیت حاصل ہے' ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد حافظ صاحب نے اس کتاب کی زبان پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس فقرہ میں مصادر کے آخر میں 'سو' کا استعمال نہایت عجیب ہے۔ اور اردو زبان اس کی تشریح سے قاصر ہے۔ اب اسی 'سو' کا استعمال پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ (پنجاب میں اردو ص۱۶۸)

بولیوں کے نازک اختلافات، ان میں مستعمل الفاظ کی نحوی صرفی اور صوتی خصوصیات سے متعلق شیرانی مرحوم نے جس غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال کم از کم اردو میں ان کے بعد کمیاب ہے۔ ان کے بعد معراج العاشقین کے متعلق یہ بحث تو رہی ہے کہ اس کی زبان من حیث الکل دکنی ہے یا دکنی لیکن یہ زبان نویں صدی ہجری کے ربع اول کی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں اس مسئلہ پر غالباً کسی نے غور تک نہیں کیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ۱۹۵۰ء میں (جب وہ ریسرچ اسکالر تھے) اتنی بات ضرور کہی تھی کہ:

"حضرت بندہ نواز کی نثری تصانیف کے جتنے بھی مخطوطے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ان کی زندگی میں نہیں لکھا گیا اس لئے ہم انھیں قطعی طور پر حضرت بندہ نواز سے منسوب نہیں کرسکتے۔"

(معراج العاشقین، طبع آزاد کتاب گھر دلی ص۲۱)

یہ بات بجائے خود نہایت اہم تھی لیکن [illegible] سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی ہمت پر آفریں [illegible] نے اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے بحث کی اور یہ بتایا کہ:

"مختلف داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر واضح کیا کہ معراج العاشقین حضرت مخدوم سید محمد حسینی بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کے آغاز کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔"

ڈاکٹر موصوف نے اپنے طویل مقالے میں جن ذیلی عنوانات سے بحث کی ہے درج ذیل ہیں:

(۱) متن (۲) بنیادی رسالہ (۳) معراج العاشقین نام کے نسخے (۴) معراج العاشقین کا موضوع (۵) زبان و بیان (۶) صوتی خصوصیات (۷) غلط انتساب کی توجیہ (۸) مصنف کا شیخ (۹) مخدوم شاہ حسینی (۱۰) وطن (۱۱) پیر اسد اللہ حسینی (۱۲) اولاد (۱۳) مخدوم کا کلام (۱۴) سنہ کتابت۔

یہ عنوانات خود بحث کے تنوع کو ظاہر کرتے ہیں اس میں سب سے کم در حصہ "سنہ کتابت" سے متعلق ہے مثال کے طور پر:

"کاتب محمد نصیر نے معراج العاشقین کے جس نسخہ سے نقل کیا ہے اس نسخہ پر سنہ صرف ۹۶ھ ہوگا لیکن کتابت میں سنہ کے نون کا نقطہ ۹ اور ۶ کے درمیان آگیا ہوگا جیسے ۹۰۶ھ' محمد نصیر نے اس کو ۹۰۶ پڑھا اور اس کو ہندسوں کے علاوہ عبارت میں بھی لکھ دیا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو سنہ ۱۰۹۶ھ ہوگا اس لئے کہ محمد نصیر نے اس نسخے کی نقل ۱۱۷۶ھ میں کی ہے۔"

بہرحال اس تفصیلی بحث کے بعد جو نتیجہ نکالا گیا ہے یہ ہے:۔

"جب متعدد شہادتوں سے رسالہ معراج العاشقین گیارھویں صدی ہجری کے اواخر اور بارھویں صدی ہجری کے آغاز کے عہد کی ایک شخصیت کی تصنیف ثابت ہوگیا ہو تو ۹۰۶ھ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی ایسی صورت میں سنہ کی غلطی کی تاویل و توجیہہ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

ڈاکٹر حفیظ قتیل کا یہ کارنامہ نہایت قابل قدر ہے لیکن بحث کو یہیں ختم کر دینے کے بجائے مناسب یہ ہے کہ وہ تحقیق و تلاش کے سلسلے کو جاری رکھیں تاکہ ایسی قطعی شہادت مل جائے کہ "تاویل و توجیہہ" کی ضرورت ہی باقی نہ رہ جائے۔

زیر نظر کتابچہ اگرچہ معراج العاشقین سے متعلق ہے لیکن اس کی اہمیت اس سے زیادہ ہے یہ کتابچہ ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنے تمام قدیم سرمائے کا از سر نو جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہم سے انتساب کی غلطی اور کسی موقع پر بھی تو نہیں ہوگئی ہے، یہ جائزہ بہرحال تعمیری بھی ہوگا اور مفید بھی۔

آخر میں ایک بات اور بھی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے وہ یہ کہ اس کتابچہ کے شروع میں چند مقامات پر مولوی عبدالحق مرحوم پر جو گرفت کی گئی اس میں شدت زیادہ ہے، اگر مولوی صاحب کے حالات اور مقاصد کے علاوہ ان کے زمانے پر بھی نگاہ کرلی تو یہ شدت کچھ اور

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میرا صفحہ

آج کل اردو کے لئے دیوناگری رسم خط کا بڑا چرچا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل ہندی کتب میں عربی فارسی سے ماخوذ آوازوں کے لئے مختلف حروف کے نیچے نقطے لگا کر ان کے تلفظ کو ظاہر کیا جاتا تھا۔ مثلاً ق (क़)، ف (फ़)، ز (ज़)، خ (ख़)، غ (ग़)۔ دیوناگری رسم خط ان کے وجود کو اس وقت بھی تسلیم نہیں کرتا تھا اس لئے کہ اس سے مرکب الفاظ کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندی ساہتیہ سمیلن جیسی انجمنوں نے یک لخت محسوس کیا کہ ہندی کو ان آوازوں سے "شدھ" کرنا اس کو "بھارتی" (وہ نام جو ہندی کے لئے تجویز ہوتا آیا ہے) بنانے کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ نہ صرف ان انجمنوں بلکہ اتر پردیش اور دوسری سرکاری درسی کتب سے نقطے لگانے کا طریقہ ختم کر دیا گیا یعنی ہندی بے نقط بنا دی گئی۔ اب اردو کے مروجہ الفاظ کو جیا دہ 'پھائدہ' 'کلام' کا تل لکھا جانے لگا۔ ادھر سرکاری اسکولوں میں جس تلفظ کو عام کیا جانے لگا وہ یہی ہے جس کا ابھی تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ وہ بچے بھی جن کی مادری زبان اردو ہے ان آوازوں کو صحیح طرح سے نہیں نکال پاتے۔ ان میں ق ا کا تو بالکل قتل ہو چکا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ہم لوگ پنجابی اردو کے تلفظ پر ہنسا کرتے تھے اور اقبال کے ایک شعر کی تحریف بھی اس طرح کی تھی ؎

اکبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

لیکن آج تو چاروں طرف "اکبال" ہی کا اقبال نظر آتا ہے! اغ اور دوسری آواز ہے جو شہروں اور قصبوں سے باہر نکلے تو ذرا مار کھا جاتی ہے۔ خدا بھلا کرے انگریزی تعلیم کا کہ ز ا اور ف ا کی لاج کم و بیش اب تک قائم ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے اکثر اناؤنسر ہندی خبریں سناتے وقت ان کو صحیح طرح سے ادا کرتے ہیں اور ایک آدھ ان میں تو قاری بھی معلوم ہوتا ہے کہ ق ا کی ادائیگی تک صحیح طرح سے کرتا ہے جو کسی طرح ان خبروں کے سنسکرت سے بھرے الفاظ سے تال میل نہیں رکھتا۔

چنانچہ جب کبھی یہ تجویز میرے سامنے آتی ہے کہ اردو کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کر لیا جائے تو میں بے اختیار اردو کے پسندیدہ اشعار کو اس رسم خط میں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور پھر انھیں بے نقط ہندی کے لہجہ میں گنگنا کر عبرت ناک مزہ کا لطف لیتا ہوں۔

کسے کھبر کہ ہزاروں مکام رکھتا ہے
وہ پھکر جس میں ہے بے پردہ روہِ کرآنی

مری مینائے گل میں تھی جرا سی باکی
شیکہ کہتا ہے کہ یہ بھی ہرام اے ساکی

کیا وہ نمرود کی کھدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کید میں ہے ترے وہشی کو وہی جلپھوں کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ جنجیر بھی تھا

ہیں آج کیوں جلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاکھیٔ پھرشتہ ہماری جناب میں

نہ تھا کچھ تو کھدا تھا کچھ نہ ہوتا تو کھدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا گم　　مکاماتِ آہ و پھگاں اور بھی ہیں

نہیں کہ مجھ کو کیامت کا اعتکاد نہیں
شبِ پھراک سے روجِ جزا جیاد نہیں

وہ بھی کتنی تھی ہجابِ دید کی منجل سے دور
جس سپھر میں احتیاجِ کعبہ و بت کھانہ تھا

پھر سب کا روبار شوک کے　　جوکبِ تجارہ جہاں کہاں
پھرنگی شیشہ گر کے پھن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بکھشی سکھتی کھارا

شمع بجم کھیال کے انجمِ جگر کے داگ　　جتنے چراگ ہیں تری مہپھل سے آئے ہیں

اور میں اپنی اس سعی ناسعود کو حضرت فراق کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں کہ ان کی آواز دیوناگری کی حمایت میں سب سے زیادہ بلند رہی ہے:

نگاہِ ناج تری تھی تمام کول و کسم
کسی کو ہو بھی نہ سکتا تھا کچھ گمانِ پھراک

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ و پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922　　فون نمبر ۲۹　　R. NO. 2186/57